تفسیر سورۂ فاتحہ

(مولانا عبدالحی فاروقی صدر شعبۂ اسلامیات اسلامیہ کالج، لاہور)

(رکوع ۱، آیات ۷)

قرآن کی تقسیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن پاک آہستہ آہستہ ضرورت کے مطابق نازل ہوتا رہا، اور اس کی تکمیل میں پورے ۲۳ سال لگ گئے، نبوت مل جانے کے بعد آپ ۱۳ سال تک مکہ ہی میں مقیم رہے، قرآن کریم کا بڑا حصہ اسی زمانے میں اترا، پھر جب آپ حالات سے مجبور ہو کر مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے تو باقی قرآن کا نزول وہاں ہوا جو دس سال میں پورا ہوا۔

آپ کی حیات مقدس کے دو نمایاں دور ہیں، اور دونوں کی خصوصیات و امتیازات اس درجہ ایک دوسرے سے الگ ہیں، کہ دونوں کے دو جداگانہ نام مقرر ہو گئے ہیں۔ ہجرت سے قبل کا زمانہ مکی کہلاتا ہے، اور دوسرا مدنی، اسی کے پیش نظر قرآن پاک کی تمام سورتوں کی تقسیم بھی اسی طرح کی گئی ہے۔ وہ تمام سورتیں جو قیام مکہ کے دوران میں اتریں، ان کو مکی کہا جاتا ہے، اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں، خواہ وہ حدیبیہ کے میدان میں اتری ہوں، کسی جنگ میں الہام ہوئی ہوں، یا حجۃ الوداع میں نازل ہوئیں، جمہور کا یہی مذہب ہے، اس لحاظ سے مکی سورتوں کی تعداد ۸۶ ہے اور ۲۸ مدنی ہیں، گویا کل ۱۱۴ سورتیں تمام قرآن میں ہیں۔

دونوں کی خصوصیات مکی اور مدنی سورتوں میں جو فرق ہے وہ ہر پڑھنے والے پر فوراً ظاہر ہو جاتا ہے ملاحظہ کیجیے:

مکی سورتیں

۱۔ ان میں زیادہ تر جذبات کا لحاظ کیا گیا ہے۔

۲۔ دعوت و تبلیغ اسلام پر زور ہے، طرز خطاب میں نرمی اور ملاطفت پیش نظر ہے، اور جہاد کا ذکر

نہیں۔

۳۔ فواصل کا لحاظ رکھا گیا ہے اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے۔

۴۔ الفاظ پُر عظمت اور پُر شکوہ ہیں۔

۵۔ توحید، قیامت اور عبرت و موعظت پر مشتمل ہیں۔

۶۔ اعمال و عبادات کا مطالبہ بہت کم ہے، زیادہ تر عقائد سے بحث کی گئی ہے۔

۷۔ یہود و نصاریٰ سے کوئی جھگڑا نہیں۔

۸۔ چھوٹی چھوٹی آیتیں اور چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں۔

۹۔ یا ایہا الناس کے لفظ سے خطاب کیا جاتا ہے، یا ایہا الذین آمنوا کا لفظ کہیں نظر نہیں آتا۔

مدنی سورتیں

۱۔ خیالات میں گہرائی اور عمق ہے۔

۲۔ نشر و اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ جہاد کا بھی حکم ہے۔

۳۔ فواصل کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور جو ہیں تو وہ بڑے بڑے۔

۴۔ قانونی الفاظ ہیں۔

۵۔ احکام اور قوانین ہیں۔

۶۔ اعمال اور عبادات کا سب سے زیادہ مطالبہ ہے

۷۔ اہل کتاب سے باقاعدہ مناظرہ ہے

۸۔ بڑی بڑی آیتیں اور بڑی بڑی سورتیں ہیں۔

۹۔ لوگوں کو عام طور پر یا ایہا الذین آمنوا سے خطاب کیا جاتا ہے یا ایہا الناس کا لفظ بہت کم آتا ہے۔
صرف سات آیتیں ایسی ہیں جن میں یا ایہا الناس سے خطاب کیا گیا ہے اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) یَا اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ (۲ : ۲۱)

(۲) یَا اَیُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا (۲ : ۱۶۸)

(۳) يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ (۴: ۱)

(۴) إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ (۴: ۱۳۳)

(۵) يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ (۴: ۱۷۰)

(۶) يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ - (۴: ۱۷۵)

(۷) يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى (۴۹: ۱۳)

اسی فرق کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یوں بیان فرماتی ہیں:

انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار حتى إذا ثاب الناس الى الاسلام، ثم نزل الحلال والحرام، ولو نزل اول شيء لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابداً، ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابداً، لقد نزل بمكة وانا جارية العب بل الساعة موعدهم والساعة ادهى وامر، وما نزلت سورة البقرة والنساء الا وانا عنده (بخاری)

ابتدا میں سُوَرِ مفصل نازل ہوئیں، جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر تھا، یہاں تک کہ لوگ وا نُرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ پھر (احکام) حلال و حرام کا نزول شروع ہوا۔ اگر شروع ہی سے یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب پیو تو لوگ کہتے ہم کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے اور اگر یہ (حکم نازل) کیا جاتا کہ زنا نہ کرو تو کہہ دیتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے۔ جب یہ (آیت) نازل ہوئی بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر، تو میں اس وقت ابھی کھیلنے کودنے والی بچی تھی اور سورۂ بقرہ و نسار کا نزول اس وقت ہوا جب میں خود اُن (رسول اللہؐ) کے پاس موجود تھی۔

اس کی حکمت: مدنی سورتوں میں تدبیرِ منزل، سیاستِ مدن، اور خلافتِ کبریٰ کے احکام و ضوابط اور امت کی تشکیل و تنظیم کے اصول و قوانین پر بحث کی گئی ہے۔ اور مکی سورتوں میں توحید، قیامت، رسالت اور اخلاقِ فاضلہ پر زور دیا گیا ہے، یہ نمایاں امتیاز اس لیے ہے کہ اگر ابتدا ہی میں اہلِ عرب کو اعمالِ فاسقہ کو چھوڑنے اور مدنی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا تو بہت کم لوگ اس صدا پر لبیک کہتے، اس لیے ان لوگوں کی اصلاح و تہذیب کے لیے یہ حکیمانہ صورت اختیار کی گئی، کہ شروع میں انہیں جزائے اعمال کی طرف توجہ

دلائی گئی اور یہ بتا دیا گیا کہ ایک ایسی قوتِ قاہرہ بھی موجود ہے جو تمہارے ایک ایک عملِ حیات کو گہری نظر سے دیکھ رہی ہے، وہ تمہارے کسی کام کو ضائع نہیں ہونے دے گی، تمہیں اس کا بدلہ ضرور ملے گا اور اس وقت کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی تمہاری مدد نہ کر سکے گی، بلکہ ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار اور جواب دِہ ہو گا۔

رسول کی ضرورت جب ایک شخص خدا کے وجود اور اپنی ذمہ داری و مسئولیت کو دل کے ساتھ یقین کر لے تو اب وہ خود بخود اس امر کی ضرورت محسوس کرے گا کہ اسے اخلاقِ فاضلہ اور جرائم کا علم ہو تاکہ وہ معصیت سے پرہیز کرکے نیکی کی راہ اختیار کر سکے، مگر خود انسان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ماحول سے متاثر ہو کر اپنی فطرتِ صالحہ کے صاف و شفاف آئینہ کو گرد آلود کر لیتا ہے، حجابِ طبع، حجابِ رسم، اور حجابِ سوءِ معرفت اس کے قلبِ سلیم کو بالکل تاریک و مظلم بنا دیتے ہیں؛ ظلمٰت بعضہا فوق بعض، اور وہ اس طرح راہِ حق سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اس لیے قدم قدم پر اس کو ایک ہادی اور رہبر کی ضرورت ہے، جو اس کو نیکی اور بدی کی راہ دکھا دے اور راستہ کے تمام نشیب و فراز سمجھا دے، یہی وجہ ہے کہ ہر مسلم تا اَبد دن میں پانچ وقت اللہ کے حضور میں کھڑا ہو کر اھدنا الصراط المستقیم کی دعا مانگتا ہے۔

قرآن حکیم نے فطری طریقِ تعلیم اختیار کیا، جب خدا کے وجود، اور اپنی ذمہ داری کو وہ لوگ سمجھ گئے تو انھیں بتایا گیا کہ اس اللہ کے ساتھ رشتہ قائم کرنے کے لیے وہ اپنا رسول بھیجتا ہے، اس کے پاس اس کے احکام و فرامین ہوتے ہیں، تمہارا فرض ہے کہ اس کا اتباع کرو تاکہ راہِ حق پا سکو۔

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی، فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ، اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۲ : ۳۸ : ۳۹)

جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو اس کی پیروی کرو، تو جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی، ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ اور جنہوں نے اس کو قبول نہ کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ اس میں

ہمیشہ رہیں گے۔

قلب القرآن اگر آپ مکی سورتوں کو مدنی حصہ سے الگ کر لیں تو آپ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ ان سورتوں میں زیادہ تر توحید، رسالت اور جزائے اعمال پر زور دیا گیا ہے، اگر اعمال کی طرف توجہ کی گئی ہے تو بہت کم، اس لیے کہ عمل نتیجہ ہے، عقائد صالحہ اور یقین و اذعان کا، جب تک ایک خیال آپ کے دل میں مستحکم و استوار نہ ہو گا اس سے داعیۂ عمل کے پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں، اس لیے عملاً قانونی زندگی مدینہ منورہ ہی سے شروع ہوتی ہے۔

دنیا میں جس قدر انبیاء و رسل مبعوث ہوئے، ان سب میں اصول و کلیات کے اعتبار سے ذرہ برابر بھی فرق نہیں، سب کے سب انہیں عقائد و یقینیات کی دعوت دیتے ہیں، جن پر تمام مذاہب و ادیان متفق ہیں، اور وہ یہی توحید، رسالت اور قیامت ہیں، یہی وجہ ہے کہ سورۂ یٰسین کو حدیث میں قلب القرآن کہا گیا ہے کیونکہ اس میں ان ہی امہاتِ مسائل پر بحث کی گئی ہے، سورۂ اخلاص میں صرف توحید کا ذکر تھا، اس لیے لسانِ نبوت نے اس کو ثلثِ قرآن فرمایا۔

ترتیبِ نزول علمائے تفسیر اس امر میں مختلف الرائے ہیں کہ سب سے پہلے کونسی سورت نازل ہوئی ہے، ایک خیال یہ ہے کہ ناموسِ الٰہی نے اولین مرتبہ جب رسول اللہ کو مخاطب کیا تو کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ ان کے نزدیک پہلا الہام ان پانچ آیتوں کا ہوا، اور اس کے بعد کچھ دیر کے لیے وحی رک گئی۔

دوسرے حضرات یوں فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئی ہیں، یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (۷۴: ۱تا۷)۔ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ اولیت کا شرف سورۂ فاتحہ کو حاصل ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ تینوں قول اپنی اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہیں، اور باریک بین نظر سے دیکھا جائے تو کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا، اور ہر ایک کی صحت واضح ہو جاتی ہے۔

جداگانہ حالات اصل بات یہ ہے کہ حالات و واقعات کی جداگانہ نوعیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے سب سے پہلے خود صاحبِ الہام کو اس امر کے لیے تیار کرنا ہے کہ اس سے رشد و ہدایتِ عالم کا اہم و اعظم کام لیا جانے والا ہے، وہ اس بارِ گراں کو متحمل ہونے کو تیار رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جب وادیٔ طُویٰ میں سے گذر ہوا، اور انہوں نے دُور سے آگ دیکھی تو اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر آگ لینے کے لیے درخت کے پاس گئے وہاں انھیں یوں مخاطب کیا گیا:

اِنِّیٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی وَاَنَا اخْتَرْتُکَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی، اِنَّنِیٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ۔ (۲۰: ۱۲ تا ۱۴)	میں تو تمہارا پروردگار ہوں تو اپنی جوتیاں اتار دے، تو یہاں پاک میدان طُویٰ میں ہے، اور میں نے تجھ کو انتخاب کرلیا ہے، تو جو حکم دیا جائے اسے سُن بے شک میں ہی خدا ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میری عبادت کیا کر، اور میری یاد کے لیے نماز پڑھا کر۔

جب نبی کو اطلاع مل گئی کہ وہ خدائے قدوس کی طرف سے مبعوث فرمایا گیا ہے، تو اب اسے یہ بتایا جاتا ہے کہ اسے اپنی تمام زندگی کس اہم و اقدم فرض میں صرف کرنی ہوگی۔ اس کے تمام معمولات و اوقات کس کام کی تعمیل و تکمیل میں خرچ ہونگے، اور کس قدر صبر و استقامت سے کام لینا پڑے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا۔

اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی (۲۰: ۴۳، ۴۴)	دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو رہا ہے اور اس سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے۔

لیکن ابھی تک اس کے سامنے کوئی مدوّن و مرتب قانون اور دستور العمل نہیں ہے جس کی طرف دعوت دے، اب اسے پہلی مرتبہ وہ سبق پڑھایا جاتا ہے جو تمام گندگیوں اور ناپاکیوں کو دور کرنے والا، ہر روگ اور بیماری کا بہترین مداوا، درماندگیوں، ذلتوں اور رسوائیوں سے نجات دینے والا، اور فلاح و کامرانی کا ذمہ دار و کفیل ہے، جس پر عمل کر کے خوف اور ڈر سے نجات مل جاتی ہے:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.

جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو اس کی پیروی کرنا، کہ جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔

تطبیق کی راہ | اس تفصیل کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جن اربابِ فضل و کمال نے سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتوں کو اولین وحی قرار دیا تو ان کا مطلب یہ تھا کہ ہدایتِ عالم کے فرضِ جلیل پر فائز ہونے کی اطلاع سب سے پہلے سورۂ علق ہی میں دی گئی، اور جن بزرگانِ ملت نے دوسری جہت پر نظر کی تو ان کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ اِنذار و تبلیغ کا سب سے پہلا حکم اسی سورۂ مدثر ہی میں دیا گیا، لیکن اگر یہ دریافت کیا جائے کہ سب سے پہلے کونسی سورۃ پوری کی پوری اُتری، جو ایک مدون و مرتب قانون و دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے تو سب کا فیصلہ یہی ہوگا کہ اس لحاظ سے صرف سورۂ فاتحہ ہی وہ سورۃ ہے جو سب سے پہلے نازل کی گئی۔

سورت کا نام | یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم کی تمام سورتوں کی تعداد ۱۱۴ ہے۔ ہر سورت کا نام اس کی کسی نہ کسی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھ کر مقرر کیا گیا ہے بعض ایسی سورتیں بھی ہیں جن کے ایک سے زیادہ نام ہیں، سورۂ فاتحہ اس لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ صاحبِ روح المعانی کے بیان کے مطابق اس کے ۲۰ سے زائد نام ہیں، بعض کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ فاتحۃ الکتاب، اس سے قرآن کریم کی ابتدا ہوتی ہے۔

۲۔ فاتحۃ القرآن،

۳۔ ام الکتاب، عربی زبان میں اُمّ ایسی چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے اندر جامعیت رکھتی ہوں، فوج کے جھنڈے کو اُم کہتے ہیں کیوں کہ فوج اس کے پیچھے جمع ہوتی ہے، مکہ مبارکہ کا نام ام القریٰ بھی ہے، اس لیے کہ حج کے موسم میں عرب کے تمام شعوب و قبائل وہاں جمع ہوتے تھے۔

۴۔ الراس، مرکزِ دماغ کو کہتے ہیں، قرآن کریم میں جس قدر مطالب تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں ان کو اجمالاً اس سورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ ام القرآن ہے۔

۵۔ الکنز

۶۔ الوافیہ

۷۔ الکافیہ، اگر ایک شخص نماز میں اس سورت کو پڑھے اور کچھ نہ پڑھے تو بھی یہ کافی ہو جائے گی۔

۸۔ اساس القرآن، یہ اجمال ہے، اور قرآن اس کی تفصیل۔

۹۔ الحمد،

۱۰۔ الشکر،

۱۱۔ الدعا،

۱۲۔ تعلیم المسئلہ

۱۳۔ السؤال

۱۴۔ المناجاۃ

۱۵۔ التفویض، انسان جب اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہتا ہے تو وہ خدائے قدوس سے سرگوشی کرتا ہے، اور اپنے آپ کو اس کی تفویض میں دے دیتا ہے۔

۱۶۔ الرقیہ،

۱۷۔ الشفاء،

۱۸۔ الشافیہ

۱۹۔ الصلوٰۃ، اس لیے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی: لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب، جو شخص سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز ہی نہیں ہوتی، قرآن کریم کی کسی سورت کی اگر دو چار آیتیں بھی آپ پڑھ لیں تو نماز ہو جائے گی مگر اس سورت کے آپ ٹکڑے نہیں کر سکتے، بلکہ پوری کی پوری پڑھنی ہوگی

۲۰۔ نور، مومن کے دل میں نور پیدا کرتی ہے،

۲۱۔ القرآن العظیم، وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ، (۱۵: ۸۷) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات دہرائی جانے والی چیز عطا فرمائی ہے، اور قرآن عظیم۔

۲۲۔ السبع المثانی، اس سورت کی سات آیتیں ہیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں، نماز کی ہر رکعت میں اس کا پڑھنا ضروری ہے، بعض روایات میں اس کو اعظم سورۃ فی القرآن اور آخر سورۃ فی القرآن بھی کہا گیا ہے۔

ناموں کی یہ تفصیل آپ کے سامنے ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اتنے نام کسی اور سورت کے بھی ہیں، ناموں کی یہ کثرت ہمیں ایک طرف تو یہ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس چھوٹی سی سورت کو کس قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، دوسری جانب اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حقیقت میں قرآن کریم کے تمام مطالب پر اجمالاً حاوی ہے،

اجمال کی تفصیل قریبًا تمام مفسرین نے اس اجمال کی تفصیل بیان کی ہے، صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:

انها مشتملة على اربعة انواع من العلوم التى هى مناط الدين (الاول) علم الاصول ومعاقده معرفة الله تعالى وصفاته واليها الاشارة بقوله رب العلمين الرحمن الرحيم ومعرفة النبوة وهى المراد بقوله تعالى انعمت عليهم و المعاد الموحى اليه بقوله تعالى مالك يوم الدين (الثانى) علم الفروع أسُّه العبادة وهو المراد بقوله اياك نعبد وهى بدنية و مالية، وهما مفتقران الى امور المعاش من المعاملات والمناكحات، ولابد لها من الحكومات، فتمهدت الفروع على الاصول

وہ علوم جو دین کی اصل و اساس ہیں وہ چار ہیں، اور یہ سورت ان چاروں پر حاوی ہے (۱) علم اصول اللہ تعالیٰ کے صفات و مختصات کی پہچان، الحمد للہ رب العلمین الرحمن الرحیم میں اسی طرف اشارہ ہے، نبوت کی شناخت کے لیے صراط الذین انعمت علیہم ہے اور مالک یوم الدین کا اشارہ قیامت کی طرف ہے (۲) علم فروع۔ اس کی اصل و اساس عبادت ہے، ایاک نعبد سے یہی مراد ہے۔ عبادت بدنی بھی ہوتی ہے اور مالی بھی، اسی ذیل میں معاملات آجاتے ہیں جس میں معیشت، مناکحت اور حکومتیں آجاتی ہیں (۳) علم الاخلاق، جس سے کمالِ انسانیت حاصل ہوتا ہے، وصول الی اللہ کا یہی واحد ذریعہ ہے

(الثالث) علم ما به يحصل الكمال، وهو علم الاخلاق واجل‌ا الوصول الى الحضرة الصمدانية والسلوك لطريقة الاستقامة فى منازل هاتيك الرتب العلية، واليه الاشارة بقوله اياك نستعين، اهدنا الصراط المستقيم (الرابع) علم القصص، والاخبار عن الامم السالفة السعداء الاشقياء، وما يتصل بهما من الوعد والوعيد، وهو المراد بقوله تعالى انعمت عليهم، غير المغضوب عليهم ولا الضالين

اسی سے استقامت نصیب ہوتی ہے، جس کا نتیجہ منازل علیہ کا کسب حصول ہے۔ ایاک نستعین، اھدنا الصراط المستقیم اسی طرف مُشیر ہے (۴) علم القصص گذشتہ امتوں کے واقعات، شقی وسعید کے واردات، پھر اس ذیل میں ترغیب و ترہیب ..... وعید وغیرہ، صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم و الضالین میں اسی کا اجمالاً ذکر ہے۔

(ص۳ ج اول) المطبعة الکبریٰ الامیریہ مصر ۱۳۰۱ھ)

شاہ ولی اللہ | لیکن اس مطلب کو جس لطیف و دل آویز انداز میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے اپنی مشہور کتاب الفوز الکبیر میں بیان کیا ہے وہ نہایت ہی اطمینان بخش معنی خیز اور حقائق مستورہ کو بے حجاب کرنے والا ہے، آپ فرماتے ہیں۔

" باید دانست کہ معانی منظومۂ قرآن خارج از پنج علم نیست۔ (۱) علم احکام از واجب و مندوب و مباح و مکروہ و حرام : خواہ از قسم عبادات باشد، یا تدبیر منزل یا سیاست مدینہ، وتفصیل ایں علم بذمہ فقیہ است، (۲) وعلم مخاصمہ با چہار فرقۂ ضالہ، یہود و نصاریٰ و مشرکین و منافقین، وتفریع بریں علم ذمۂ متکلم است (۳) وعلم تذکیر بآلاء اللہ، از بیان خلق آسمان و زمین والہام بندگان بانچہ ایشاں را دری بایست، واز بیان صفات کاملہ او تبارک و تعالیٰ۔ (۴) وعلم تذکیر بایام اللہ یعنی بیان وقائع کہ آں را خدائے تعالیٰ ایجاد فرمودہ است از جنس انعام مطیعین وتعذیب مجرمین (۵) وعلم تذکیر بموت ومابعد آں از حشر ونشر وحساب و میزان جنت ونار، وحفظ تفاصیل ایں علوم والحاق احادیث و آثار مناسبۂ آں وظیفہ واعظ ومذکر است

سات آیات آپ نے ابھی اوپر پڑھا ہے کہ قرآن پاک نے اس کو سات دہرائی جانے والی سورت کہا ہے، اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں۔ بعض صحابہ اس کو سورت کا جز قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے، مگر جمہور صحابہ کی رائے یہ ہے کہ صرف یمن و برکت کے خیال سے اس کو سورۂ فاتحہ کے شروع میں لکھ دیا گیا ہے۔ ورنہ یہ اس کا حصہ نہیں، ہر سورت کے شروع میں اس کو اس لیے لکھا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ایک سورت ختم ہو گئی اور دوسری کا آغاز ہوا۔ البتہ یہ بالکل واضح ہے کہ سورۂ نمل کی یہ آیت ضرور ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہری نماز میں بسم اللہ کو بلند آواز سے کبھی نہیں پڑھا۔ یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی تھی، ان میں سے کوئی بھی بسم اللہ کو بلند آواز سے نہیں پڑھتا تھا۔ عبداللہ بن المغفل کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ نماز میں بلند آواز کے ساتھ بسم اللہ پڑھ رہا تھا، میرے والد نے سن کر کہا یہ کیسی بدایت ہے؟ میں نے رسول اللہ، ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ وہ اپنی قرأت الحمد للہ رب العٰلمین سے شروع کیا کرتے تھے، جب تم نماز شروع کرو تو الحمد للہ رب العٰلمین سے کرو۔ طبرانی میں ایک روایت اس طرح آتی ہے کہ رسول اللہ، ابوبکرؓ، عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ آہستہ سے بسم اللہ پڑھا کرتے تھے، مسلم کی حسب ذیل روایت اس پر مزید روشنی ڈالتی ہے

عن ابی ھریرۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول، قال اللہ تعالیٰ قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل فاذا قال الحمد للہ رب العٰلمین، قال اللہ تعالیٰ حمدنی عبدی و اذا قال الرحمٰن الرحیم، قال اثنیٰ علی عبدی، و اذا قال مالک یوم الدین،

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ یوں کہتا ہے، میرے درمیان اور میرے بندے کے درمیان نماز آدھی آدھی ہے اور بندہ جو مانگے گا اسے مل جائے گا، جب اس نے الحمد للہ رب العٰلمین کہا تو اللہ نے فرمایا میرے بندے نے میری حمد کی۔ جب اس نے الرحمٰن الرحیم کہا، گویا اس نے میری ثنا کی، جب اس نے مالک یوم الدین کہا تو

قال اللہ تعالیٰ مجّدنی عبدی، واذ قال ایاک نعبد وایاک نستعین، قال اللہ تعالیٰ ھٰذا بینی وبین عبدی، ولعبدی ماسأل، فاذا قال اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین، قال ھٰذا لعبدی ولعبدی ماسأل۔

اس نے میری بزرگی بیان کی اور جب اس نے یوں کہا ایاک نعبد وایاک نستعین، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کو وہ سب کچھ مل جائے گا جو وہ مانگتا ہے، اور جب اس نے اہدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہا تو اللہ نے کہا، یہ میرے بندے کے لیے مخصوص ہے اور جو کچھ اس نے مانگا وہ سب دے دیا گیا۔

اگر بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا جزو ہوتی تو اس کا سب سے پہلے اس روایت میں ذکر آتا، اس لیے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی کہ یہ سورت کا حصہ نہیں ہے بلکہ محض برکت کے لیے ہر سورت کی ابتدا میں لکھی جاتی ہے، چنانچہ ثوری، ابن المبارک، ابن مسعود، ابن الزبیر، عمار بن یاسر، حسن بن ابی الحسین، شعبی، نخعی، قتادہ، عمر بن عبدالعزیز، اعمش، زہری، مجاہد اور احمد کی یہی رائے ہے، اور یہی حنفیہ کا مذہب ہے کہ وہ جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ کی قرأت الحمد للہ سے شروع کرتے ہیں۔

یہ تفصیل جو اوپر گذر چکی ہے، اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیات یہ ہیں، (۱) الحمد للہ رب العالمین (۲) الرحمٰن الرحیم (۳) مالک یوم الدین (۴) ایاک نعبد وایاک نستعین (۵) اھدنا الصراط المستقیم (۶) صراط الذین انعمت علیہم (۷) غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔

ہر کام کی ابتدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب کسی کام کو شروع کرتے تو بسم اللہ پڑھ لیتے، آپ نے فرمایا: کل ذی بال لم یبدأ بہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فھو ابتر، اس کے پڑھ لینے سے دل میں یہ خیال برابر قائم رہتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں محض اس پروردگار کے لطفِ عمیم اور بے پایاں کرم کا نتیجہ ہے، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔

قرآن کریم کی ہر سورت کے شروع میں جو بسم اللہ لکھی گئی ہے اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے

کہ اس سورت میں جس قدر اوامر و نواہی اور آیات بینات ہیں ان کا نزول اللہ ہی کی طرف سے ہوا ہے کسی انسانی قوتِ فکر کا اس میں کوئی دخل نہیں، سورۂ علق کی ابتدا یوں ہوئی: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ، یعنی آپ ان آیات کی تلاوت کیجیے اور یہ سمجھ لیجیے کہ خدائے قدوس کا یہ فضل خصوصی تھا جو اس نے آپ کو راہِ حق دکھا دی: وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى اب اس لازوال نعمت کا شکریہ ہے کہ تمام اقوام و ملل میں اس کو پھیلا دیجیے کہ وہ اس قرآن کی بدولت دنیا و آخرت کی نعمتوں سے مالا مال ہوں: وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اور اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ، اسی طرف راہ نمائی کرتی ہیں۔

حمد و ثنا | عربی زبان میں حمد کے معنی ثنائے جمیل کے ہیں: الثناء باللسان علی الجمیل الاختیاری یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ صفتیں دونوں قسم کی ہو سکتی ہیں، اچھی بھی، اور بری بھی، حمد صرف ان صفات کے لیے مخصوص ہے جو اچھی ہوں، مدح بھی ثنا کے معنی میں آتا ہے مگر دونوں میں فرق ہے، اگر آپ کسی دل فریب منظر، خوب صورت پہاڑ، اور قیمتی ہیرے کو دیکھیں تو بے اختیار آپ کی زبان پر اس کی مدح و ستائش آنے لگ جائے گی، اس کی حمد نہ کرے گی، ایک شخص کی مدح میں رطب اللسان ہو سکتے ہیں، خواہ اس نے آپ پر احسان کیا ہو، یا نہ کیا ہو، حمد اسی صورت میں ہوگی جب آپ پر اس نے لطف و کرم کی بارش کی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مداحین کی مذمت فرمائی ہے: احثوا التراب فی وجوہ المداحین اور حمد تو مطلوب و مقصود بالذات ہے۔

حمد پر جو الف لام داخل ہے، اسے بعض حضرات نے استغراق کا کہا ہے، اور دوسروں نے جنس کا، ہمارے نزدیک دونوں قول درست ہیں، مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر حسن و جمال، کمال و خوبی اور بخشش و فیضان ہے، خواہ وہ کہیں ہو، اور کسی شکل میں ہو، سب اسی واجب الوجود کی کارسازی و کارفرمائی ہے، اور جس قدر اور جیسی کچھ حمد و ثنا کی جائے گی وہ حقیقت میں اسی قدوس حق نواز کی ہوگی جو تمام محاسن و کمالات کا جامع اور سرچشمہ ہے، جس کی ذات حسن ہی حسن اور خوبی ہی خوبی ہے۔

اللہ | اصل میں الٰہ تھا، اس کے ہمزہ کو محذوف کر دیا گیا اور اس پر الف لام داخل کر دیا گیا، لغت

میں الٰہ ہر معبود پر بولا جاتا ہے، جس کی جمع آلہہ آتی ہے، عرب الٰہ اور آلہہ تو اپنے معبودانِ باطل پر بھی بولا کرتے تھے، قرآن میں آتا ہے: فراغ الیٰ الھتہم فقال الا تاکلون (۳۷:۹۱) پھر ابراہیم ان کے معبودان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ تم کھاتے کیوں نہیں، دوسری جگہ یوں ہے: وانطلق الملاء منہم ان امشوا واصبروا علیٰ الھتکم، ان ھذا لشیئ یراد (۳۸:۶) تو ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے اور بولے کہ چلو، اور اپنے معبودوں کی پوجا پر قائم رہو، بے شک یہ ایسی بات ہے جس سے تم پر شرف و فضیلت مقصود ہے، مگر اللہ صرف ذاتِ واحد کے لیے مخصوص تھا، اور وہ اپنے معبودوں کو اس نام سے نہیں پکارا کرتے تھے۔

حقیقت میں اللہ اسمِ ذات ہے، تمام صفات اور کمالات کو اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے: وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بہا، وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ (۷:۱۸۰) اور خدا کے نام سب کے سب اچھے ہیں، تو اس کو اس کے ناموں سے پکارو، اور جو لوگ اس کے ناموں میں کجی اختیار کرتے ہیں، ان کو چھوڑ دو، ایک جگہ فرمایا: ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین (۷:۵۶) کچھ شک نہیں کہ خدا کی رحمت نیکی کرنے والوں سے قریب ہے۔

ربّ اردو ترجمہ اس کا پالنے والا کیا جاتا ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ پاک نے اس کو زیادہ وسیع معنی میں استعمال کیا ہے، سورۂ اعلیٰ میں آتا ہے: سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى، الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ، وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ (۸۷: ۱تا۳) "اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو، جس نے انسان کو بنایا، پھر اس کے اعضاء درست کیے، اور جس نے اس کا اندازہ ٹھہرایا پھر اس کو رستہ بتایا، ان آیات میں صنعت ربوبیت کے یہ چار کام بتائے ہیں:

۱۔ خلق، کائناتِ ارضی و سماوی کی ہر چیز کو عدمِ محض سے وجود میں لانا: بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ (۲) وہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے، سورۂ انعام میں یوں آتا ہے: بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ

تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ، وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶ : ۱۰۱) "وہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اس کے اولاد کہاں سے ہو جب کہ اس کی بیوی ہی نہیں، اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے

۲- تسویہ - ہر چیز کو ظاہری و باطنی قوتیں عطا کرنا، اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر کو اس طرح آپس میں ترتیب دینا کہ سب ایک دوسرے کے مناسب و موزوں ہوں۔

۳- تقدیر - اس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو جو قوتیں عطا کی ہیں، ان کے اعمال و وظائف بھی مقرر کر دیئے ہیں، چنانچہ ہر چیز اسی اندازے کے مطابق اپنے اپنے دائرے میں مصروف عمل ہے،: وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (۲۵ : ۲) اور جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا اندازہ ٹھہرایا، دوسری جگہ آتا ہے

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا، ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ، وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ، لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶ : ۳۸ تا ۴۰)

اور سورج اپنے مقررہ راستے میں چلتا رہتا ہے، یہ خدائے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے، اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں، یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے، نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آ سکتی ہے، سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

۴- ہدایت - اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا، اس کو بہترین ظاہری و باطنی قوتیں عطا کیں، پھر ان کے اعمال و وظائف مقرر فرما دیئے، اور ان سب کی تکمیل اس طرح کر دی کہ اس کے موافق اسباب کو فراہم کر دیا، موانع کو دور کر دیا، تاکہ وہ باقی و قائم رہ کر اپنے کام میں لگ سکے، اور جن نتائج و ثمرات کی اس سے توقع ہے وہ ظہور میں آئیں،

اس کو مثال میں یوں سمجھایا جا سکتا ہے کہ ایک گھڑی ساز نے گھڑی بنانے کا ارادہ کیا، اب اس

کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ تمام ضروری سامان فراہم کرے، پرزوں کو جمع کرکے ہر کیل کانٹے کو درست کرلے، یہ گھڑی کی تخلیق، اب اس نے ان تمام پرزوں کو اس طرح مرتب کیا کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل تناسب ہوگئے، اسے تسویہ کا نام دیجیے، اس کے بعد ہر پرزے کو دوسرے کے ساتھ لگادیا، اس ترکیب کو سامنے رکھ کر اس نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ اتنی مدت تک چل سکے گی، اور اتنی دیر تک کام دے سکے گی، یہی تقدیر ہے، ان تمام مراتب کو طے کرلینے کے بعد اس نے گھڑی کو کوک دیا، اس امر کا اس نے پورا لحاظ کیا کہ وقت ٹھیک دے، گرمی سردی سے محفوظ رہے اور شکست و ریخت سے بچی رہے، یہ اس گھڑی کا مرتبہ ہدایت تھا۔

اب جو شخص اللہ کو رب العالمین کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ میری تمام ضروریات ظاہری و باطنی، جسمانی و روحانی، دینی اور دنیاوی، سب کا ذمہ دار و کفیل فقط وہی واحد و یگانہ خالق السموات والارض ہے۔

العلمین | اس کائناتِ ارضی و سماوی میں اس قدر کثرت سے عالم ہیں کہ آج تک نسلِ انسانی ان کا احاطہ نہیں کرسکی۔ عالمِ انسان، عالمِ حیوانات، عالمِ نباتات، جن کا کوئی شمار نہیں، اس بے پایاں سمندر کے چند قطرات ہیں۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (۷۴: ۳۱) اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

عالَم کی جمع عالمین ہے، یعنی بے شمار عالم، مفسرین کرام نے اس کے معنی تمام عالم کیے ہیں، جن میں جن و انس کے علاوہ حیوانات، نباتات، جمادات، دریا اور سمندر، ثوابت و سیارات اور بے شمار چیزیں شامل ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس لفظ کی وسعت سب کو احاطہ کیے ہوئے ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس جگہ جو رب العلمین فرمایا تو اس سے کیا مراد ہے۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں قرآن حکیم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ وہی اس کے معنی معین کرنے کا ذمہ دار اور ظنون و اوہام کے لیے حکم ہے۔ اگرچہ عالمین کا لفظ بکثرت قرآن پاک میں آتا ہے مگر ہم ان میں سے چند مقامات کو مخصوص کیے لیتے ہیں کہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو، سورہ آلِ عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ، فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ، وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا، وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا، وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔ (۳: ۹۶، ۹۷)	پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، وہی ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت اور جہان کے لیے موجب ہدایت، اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور جو شخص اس مبارک گھر میں داخل ہوا اس نے امن پالیا اور لوگوں پر خدا کا حق ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے، اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کریگا تو خدا بھی اہل عالم سے بے نیاز ہے۔

آل عمران میں آگے چل کر فرمایا: تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ، وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ (۳: ۱۰۸) ایک جگہ آتا ہے: إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ (۶: ۹۰) سورۂ یوسف میں یوں فرمایا: إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (۱۲: ۱۰۴) سورہ الانبیاء میں اس طرح آتا ہے: وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ (۲۱: ۷۱) اسی سورت میں یہ بھی ہے: وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱: ۹۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ارشاد ہوا: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱: ۱۰۷) سورۂ القلم کا خاتمہ اس پر ہوا وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (۶۸: ۵۲)

یہ چند آیات جو نمونے کے طور پر آپ کے سامنے ہیں، یہ سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ عالمین کے معنی اس جگہ عالم انسان یعنی اس کی تمام اقوام و ملل ہیں جو اس زمین کی پشت پر آباد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارک انسانوں ہی کی رشد و ہدایت کے لیے ہوتی تھی، وہی لوگ اس کے مخاطب ہیں، ان ہی کے لیے آپ نے فلاح و کامرانی کی راہیں کھولیں، اور ان ہی کو آپ نے دنیا و آخرت کی کامیابی کی بشارت دی: وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا (۴: ۷۹) اور ہم نے تم کو لوگوں کی ہدایت کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

سورۂ فاتحہ قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت ہے، اس میں رب العلمین فرمایا گیا، آخری سورت الناس ہے، اس میں یوں آتا ہے: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ، اوّل و آخر واضح کرتا ہے کہ اس سے مراد مختلف اقوام و ملل انسانی اور ان کے شعوب و قبائل ہیں، جن کی ہدایت و راہ نمائی اس کے ذمہ ہے: لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۲۵:۱) سورۂ شعراء میں قوم لوط کی یہ خرابی بیان کی گئی ہے: اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶: ۱۶۵) کیا تم اہل و عیال میں سے لڑکے پر مائل ہوتے ہو۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے رب العلمین سے اقوام ہی مراد لی ہیں کما صرح بہ محمد عبدہٗ

تربیت کے اقسام اللہ تعالیٰ جو قوموں اور ملتوں کی تربیت کرتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ خلقیہ، انسان کی نشو و نما ہو، اس کا جسم اپنے کمال کو پہنچے اور اس کی نفسی و عقلی قوتیں اعلیٰ ترین درجہ حاصل کریں۔

۲۔ شرعیہ، اقوام و ملل کی راہ نمائی اور ہدایت کے لیے انبیاء و رسل مبعوث ہوں، جو ان کی فطری استعداد کی تکمیل کریں، وہ حرام و حلال سے آگاہ ہوں، منہیات شرعیہ سے پرہیز کر کے محاسن و کمالات کو حاصل کریں۔

الرحمٰن الرحیم اسمائے الٰہیہ میں سے یہ دونوں نام ایک ساتھ بیان کیے گئے ہیں، شاید اسی وجہ سے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ الرحیم محض تاکید کے لیے آیا ہے، اردو ترجمہ کرنے والوں نے بھی ان کی تقلید میں دونوں کے فرق کو واضح نہیں کیا، مفتی محمد عبدہٗ رحمہ اللہ نے اس تاکید کے خیال کی بڑے زور سے مخالفت کی ہے،

اصل بات یہ ہے کہ عربی زبان میں فَعْلَان کا وزن عموماً ان صفات و مختصات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو عارضی ہوتی ہیں، مثلاً عطشان، غضبان، حیران، سکران وغیرہ، یعنی ان صفتوں کو ثبات و دوام نہیں، اب اگر وہ پیاسا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے ہے، پانی پی لینے کے بعد اس کی یہ حالت باقی نہیں رہے گی، لیکن فَعِیْل ان صفتوں پر بولا جاتا ہے جو جذبات و عوارض ہونے کی وجہ سے مستقل ہوتی ہیں، اور اپنا فعلی ظہور بھی رکھتی ہیں، پس اَلرَّحْمٰن کے معنی تو یہ ہوئے کہ اللہ کی ذات میں رحمت کے

اور رحیم کا مطلب یہ ہوا کہ تمام کائناتِ ارضی و سماوی اس کی رحمت سے فیض یاب ہو رہی ہے، یہ فعل مستقل اور دائمی ہے، جس میں کبھی انقطاع نہیں ہوتا: وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (۷ : ۱۵۵) "اور جو میری رحمت ہے، وہ ہر چیز کو شامل ہے"۔ سورۂ انعام میں فرمایا: قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ، کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶ : ۱۲) "ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے کس کا ہے؛ کہہ دو خدا کا، اس نے اپنی ذات پاک پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

عرب کے لوگ اسم رحمٰن سے واقف نہ تھے، جب صلح نامہ حدیبیہ مرتب کیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھی تو سُہیل نے اس پر اعتراض کیا اور کہا، اَمَّا الرَّحْمٰنُ فَلَا نَعْرِفُهٗ۔ اللہ پر تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر رحمٰن کو ہم نہیں پہچانتے۔ چنانچہ آپ نے صلح کی خاطر اس کو مٹا دیا۔ قرآنِ پاک میں آتا ہے، وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۲۱ : ۳۶) حالانکہ وہ خود رحمٰن کے نام سے منکر ہیں۔ سورۂ فرقان میں ہے: اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ (۲۵ : ۶۰) اور جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا،

ان لوگوں کا اسم رحمٰن سے ناواقف ہونا اس بات کا داعی ہوا کہ قرآنِ پاک میں ایک مستقل سورت اسی نام کی نازل کی گئی جس میں تفصیل کے ساتھ اس کے کرشمہ ہائے قدرت بیان کیے گئے اور ہر کرشمہ کے بعد یہ سوال ہوا: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ "اے جن و انس، تم اس کے کرشمہ ہائے قدرت میں سے کس کس کا انکار کرو گے، یہ سورت اگر غور کیا جائے تو اسم رحمٰن کی بہترین تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے متعامات میں بھی اس کے کارناموں کی تفصیل و توضیح کی، مثلاً فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی یعنی اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْش، اللہ کی سلطنت، مالکیت، تربیت عمومی اور عرش پر بلند ہونے پر دلالت کرتا ہے: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ، اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (۱۷ : ۱۱۰) کہہ دو کہ تم خدا کو اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے پکارو، جس نام سے پکارو، اس کے سب نام اچھے ہیں۔ شاید یہی اسباب تھے، جن کی وجہ سے رحمٰن بھی صرف اللہ ہی

کی ذات کے لیے مخصوص ہوگیا، اب ہم کسی انسان کو اس نام سے نہیں پکار سکتے، رحیم کہہ سکتے ہیں، قرآن پاک نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحیم کہا ہے: بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹: ۱۲۸) اسم مبارک رحیم کی اگر تفسیر دیکھنی ہو تو سورۂ شعراء کو اوّل سے آخر تک پڑھ جانا چاہیئے۔

رحمٰن و رحیم کے فرق و امتیاز باہمی کو واضح کرنے کے لیے شاید یہ مثال کچھ مدد دے سکے، دونوں ماں باپ مل کر اولاد کی تربیت کرتے ہیں، اس کی حفظ و نگہداشت میں لگ جاتے ہیں، محبت و شفقت سے اس کی نگرانی کرتے ہیں، مگر دونوں کی محبت میں نمایاں طور پر فرق دکھائی دیتا ہے، باپ اصول و کلیات پر نظر رکھتا ہے، جزئیات کی طرف اس کی کوئی توجہ نہیں ہوتی لیکن ماں ہے کہ وہ مہمات امور کی بجائے اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کا خیال رکھتی ہے، اور اس طرح دونوں مل کر اپنے بچہ کو پروان چڑھاتے ہیں، یہی حال رحمٰن و رحیم کا ہے، رحمٰن سے مراد وہ رحمت خاصہ ہے جو کائنات کی کلی ضروریات کو انجام دیتی ہے، اور اسم رحیم اس کی ہر جزئی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

(باقی آئندہ)

سیاستِ فاروقیؓ

(محمد کرد علی)

[شام کے مشہور فاضل اور دمشق کی مجمع العلمی العربی کے صدر محمد کرد علی دورِ حاضر کے ایک باکمال عالم، ایک زبردست مورخ اور صاحبِ طرز ادیب تھے۔ صاحبِ موصوف ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں وفات پائی۔ عربی ادب اور تاریخ نویسی پر اُن کی نظر گہری اور ناقدانہ تھی سادہ نگاری ان کی انشا کا زیور تھی۔ اسلوبِ بیان صاف و رواں اور تحریر عالمانہ وقار کی حامل۔ زیرِ نظر مقالہ ان کی ایک تصنیف: الاسلام و الحضارۃ العربیہ سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب مرحوم نے دو جلدوں میں تحریر فرمائی تھی اور حق یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے مصنف کی وسعتِ معلومات اور قوتِ استدلال کا ایک گہرا نقش قاری کے دل پر بیٹھتا ہے]

اپنی جانشینی کے لیے حضرت اُبوبکر نے حضرت عمرؓ بن خطّاب کو انتخاب کیا اور اس سلسلہ میں اپنے اُن ساتھیوں سے مشورہ فرمایا، جن کی سیاسی بصیرت مسلّم و ممتاز تھی۔ انہی اہل الرائے اصحاب میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی تھے۔ انھوں نے صدیق اکبرؓ سے کہا: "عمرؓ کے متعلق آپ کی جو رائے ہے، بخدا ہم اُنھیں اس سے بھی افضل سمجھتے ہیں[1]۔ لیکن ان کے مزاج میں سختی ہے"۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں فرمایا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مجھ میں نرمی پاتے تھے، لیکن ذمّہ داری جب خود اُن پر آپڑے گی تو وہ اپنی بہت سی عادتیں چھوڑ دیں گے۔ ابو محمد! میرا تجربہ ہے کہ جب میں کسی پر غصہ ہوتا تو وہ غصہ فرو کرنے کی کوشش کرتے اور نرمی دیکھتے تو سختی کا مشورہ دیتے"۔ جب حضرت ابوبکرؓ کی بیماری نے شدّت اختیار کی تو بالاخانہ پر تشریف لے گئے، نیچے آدمی جمع تھے، اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا: "کیا تم اس شخص کو پسند کرو گے جسے میں ولی عہد مقرر کر دوں؟ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے غور و فکر میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی؛

[1] تاریخ الطبری